شبلی نعمانی کی ملی شاعری

مبشر حسین (ریسرچ سکالر پی ایچ۔ڈی،اردو)
ڈاکٹر محمد ارشد اویسی صدرِ شعبہ اردو لاہور گیریژن یونیورسٹی،لاہور

Abstract:

Molana Shibli Nomani was a great religious scholar writer, and poet. He had a deep look over national and global politics. The feelings of patriotism, freedom and Muslim brother hood were widespread in his veins .He availed a lot of opportunities to express his emotions through poetry, writings, speeches and activities in his life. He was born at the time, when the Muslim world were suffering in slavery. The Turkish government was scattering and Western Shukla India was engaging in its political and cultural grip. In this, in the autumn, he gave a strong move to awaken his nation and break the chains of slavery through poetry. In this article, a brief overview of his Muslim loving passion has been presented from his poetry.

مولانا شبلی نعمانی کی شخصیت ہشت پہلو نگینے کی مانند تھی،وہ شاعر وادیب ہونے کے ساتھ ساتھ دانشور، مفکر، مصلح، معلم، مذہبی عالم، مورخ و سوانح نگار، اور ملکی وعالمی سیاست کے نباض اور نکتہ شناس بھی تھے۔ مسلمانانِ ہند اور عالمِ اسلام کے مسائل سے انھیں فطری لگاؤ تھا۔ مولانا ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز سال میں پیدا ہوئے، شاید اسی وجہ سے اوائل عمری ہی میں لاشعوری یا غیر محسوس طور پر وطن دوستی، حریت پسندی اور اسلام پرستی کے جذبات ان کے رگ وپے میں موجزن تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شدت اور حدت متلاطم خیز صورت اختیار کرتی گئی۔ ان جذبات کا اظہار موقع بہ موقع ان کی شاعری، تحریروں، تقریروں اور سرگرمیوں کے ذریعے ہوتا رہا ہے۔ معروف معنوں میں مولانا سیاسی آدمی نہیں تھے لیکن ایک طرف ملتِ اسلامیہ سے قلبی تعلق اور اتحاد اسلامی کے شدید جذبے اور دوسری طرف اقوامِ مغرب کی استعماریت اور چیرہ دستیوں کے باعث ان سے نفرت کے احساس نے انھیں سیاست سے دور نہیں رہنے دیا۔

علامہ شبلی نعمانی حقیقی معنوں میں ایک بیدار مغز، دور اندیش اور عبقری شخصیت کے حامل انسان تھے۔ وہ جس دور میں پیدا ہوئے عالمِ اسلام پر غلامی کے دبیز سائے منڈلا رہے تھے۔ ترکی کی حکومت بکھر رہی تھی اور مغربی شکنجہ

ہندوستان کو اپنی سیاسی اور تہذیبی گرفت میں جکڑے ہوئے تھا۔ اس پر آشوب عہد میں انھوں نے اپنی قوم وملت کو بیدار کرنے اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی تحریک وترغیب دی۔ بقول سید سلیمان ندوی:

> ''سیاست کا باب مولانا کے قلم کا موضوع نہ تھا تاہم وہ سیاست کے ہمیشہ دلدادہ رہے، لیکن ان کی سیاسیات بھی حقیقت میں ان کے کلامیات ہی کی وسعت کا ایک جزہے یعنی اسلامی تمدن، اسلامی تاریخ، اسلامی علوم وفنون سے جو شیفتگی تھی اس کا فطری اقتضایہ ہونا چاہیے تھا کہ ان کو اسلام کی حکومت عزیز ہو اور جی چاہتا ہو کہ وہ کتابوں میں جس کی تصویر دیکھتے رہتے تھے اس کو مجسم بھی دیکھ سکتے، دوسری طرف چمن اسلام کے پھولوں کو جن گستاخ ہاتھوں نے نوچ ڈالا ان کی طرف سے ان کو پورا انحراف ہو، یہی ان کی سیاست تھی۔''[۱]

مولانا شبلی نعمانی ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ آئے اور حالی کی طرح سر سید احمد خاں کی شخصیت سے متاثر ہو کر ان کی اصلاحی تحریک کے ایک نامور کارکن بن گئے۔ اسی تحریک کے زیر اثر انھوں نے ملت کی بربادی کا درد اور احساس شدت سے قبول کیا۔ انھوں نے شاعری کو اپنا مستقل شعار نہیں بنایا کیونکہ ان کا اصل مقام تاریخ نگاری تھا، تاہم انھوں نے بعض قومی اور ملی مسائل اور واقعات پر طبع آزمائی کر کے اردو شاعری میں قابل قدر اضافہ کیا۔ انھوں نے جس دور میں شاعری کا آغاز کیا، دنیا کے اکثر وبیشتر ممالک انگریزی سامراج کی چکی میں پس رہے تھے، مسلم ممالک میں کئی تنظیمیں اور تحریکیں اپنے سیاسی عزائم کے استحکام کی خاطر سرگرم عمل تھیں، امتِ مسلمہ کو آئے روز نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

برصغیر کے مسلمان شاعروں کا پوری امتِ مسلمہ بالخصوص عربوں اور ترکوں کے مسلمانوں کے واقعات سے متاثر ہونا اور ان کے مسائل سے دلچسپی لینا ایک عام اور مشترک بات ہے اور یہ رجحان مختلف مواقع پر ظاہر ہوتا رہا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ مسلمان شاعروں کا دل ہمیشہ اپنے خطے سے باہر رہنے والے مسلم بھائیوں کے ساتھ وابستہ اور جذبہ اخوت سے لبریز ہوتا ہے، اسی لیے شاعر اسلامی تہذیب کی عظمت رفتہ کے آثار ونقوش کے گن گاتے ہیں اور کسی بھی مسلمان ملک میں پیش آنے والے سانحے پر خون کے آنسو بہاتے ہیں خواہ ان کے ملک کی زبان اور کلچر کچھ بھی ہو، لہٰذا شبلی جیسے ذکی الحس اور ملتِ اسلامیہ کے حقیقی دردمند بھلا دوسروں سے پیچھے کیسے رہ سکتے تھے؟

شبلی کی شاعری کے دو مختلف ادوار ہیں۔ پہلا دور سر سید کی اصلاحی تحریک کے زیر اثر ہے۔ اس میں شبلی علی گڑھ کالج سے وابستہ رہے۔ اس دور میں انھوں نے پانچ نظمیں لکھیں جس میں دو نظمیں مثنوی ''صبح امید'' اور ''مسدس قومی'' قابل ذکر ہیں۔ ایک طویل عرصے کے بعد ان کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوا، جو پہلے دور سے مختلف تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان نے سیاسی اعتبار سے نئی کروٹ لی، اس وجہ سے اور اتحاد اسلامی کے جذبات اور احساسات سے متاثر ہو کر شبلی نے جو نظمیں لکھیں، ان میں جذبات کی شدت پہلے دور کی نظموں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ علامہ شبلی ترکی خلافت سے دل کی گہرائیوں سے محبت کرتے تھے اور جہاں کہیں اس کا ذکر آتا تو جذباتی ہو جاتے۔ اس زمانے میں ترکی ہی خلافت کا صدر مقام تھا اور ہندوستانی مسلمانوں کو یہ گمان تھا کہ ٹرکش امپائر برطانوی امپائر کو کمزور یا زیر کر دے تو برطانوی حکومت کی سامراجیت ہندوستان میں ڈھیلی پڑ جائے گی اور اس کو غلامی کے شکنجے سے نجات مل جائے گی۔ مولانا کا بھی یہی خیال تھا، اسی محبت میں انھوں نے ترکی کا سفر کیا جب وہاں سے واپس آئے تو برطانوی حکومت کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ وہ کہیں اپنا سفر نامہ نہ لکھیں، اگر ایسا ہوا تو یہ اُن کے لیے مضر ثابت ہوگا، اس لیے سفر نامہ لکھنے کے ارادے کو ملتوی کرنے کے لیے ان پر دباؤ ڈالا گیا۔ سفر نامہ لکھنے کا ارادہ تو بدل گیا مگر ان کے دل میں ترکوں کی محبت باقی رہی۔

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تو برطانیہ نے ترکی کے خلاف اٹلی کی حمایت کی۔ پھر ۱۹۱۲ء میں برطانیہ اور یورپ کی دوسری سلطنتوں کے اشارے پر بلقان کی ریاستوں نے ترکوں کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا، ان تمام سانحات کو شبلی نے خونِ دل سے رقم کیا ہے۔ عالمگیر ملت کا وہ نظریہ جس نے ہر موقع پر مسلمانان ہند کو جذباتی و نفسیاتی سہارا دیا، شبلی کو بے حد عزیز تھا۔ اس دور کی نظموں میں انھوں نے اسی جذبہ کے تحت حالات کی تبدیلی کی آرزو کی ہے۔ شبلی کے کلام کے اس ملّی پہلو سے قطع نظر وہ سیاسی رخ بھی بہت اہم ہے جس کی مثال اس سے قبل اردو شاعری میں نہیں ملتی، انھوں نے سیاست حاضرہ کی ہر رفتار کو شاعری کا حصہ بنانے کا چلن قائم کیا۔ بلاشبہ اس پر آشوب زمانہ کا شاعر اگر کوئی ہے تو وہ مولانا شبلی تھے، ہر ہفتہ جو واقعہ پیش آتا تھا اس پر وہ اس طرح کا اظہار خیال کرتے تھے کہ اس زمانہ کے بچے بچے کی زبان پر وہ اشعار چڑھ جاتے تھے ان نظموں میں جوش بیان اور طنز کا ایسا نشتر چھپا تھا کہ وہ جس پر پڑتا تھا، تلملا جاتا تھا، یہ مولانا کی شاعری کا ایسا اسلوب ہے جسے اردو شاعری میں نئی چیز سمجھنا چاہیے۔ شبلی کی شاعری ملتؔ کو کسی معین نصب العین کی طرف دعوت نہیں دیتی اور نہ کوئی متعین راستہ دکھاتی ہے لیکن اپنے دور کے واقعاتی پہلو کو بہ خوبی سامنے لاتی ہے۔ ترکی، فارس، نجد اور قیروان کے مسائل کے علاوہ انھیں برصغیر کے مسلمانوں کے مخصوص مسائل کا بھی خوب ادراک تھا۔

بیسویں صدی میں جتنی بھی تحریکیں معرض وجود میں آئیں اُن پر شبلی کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ اُن کی شخصیت اپنی زندگی میں اپنے افکار و خیالات کے ذریعے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے آرزو مند افراد کے لیے سرچشمہ توانائی بنی رہی۔ انیسویں صدی میں ہندوستان پر انگریز پوری طرح غالب آچکے تھے اور ہر طرف مغربیت اپنی چادر پھیلائے جارہی تھی تو اس وقت علامہ شبلی نے اپنی تحریروں کے ذریعے لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور نئی نسل کو نجات دلانے کی کوشش کی جو ذہنی مرعوبیت کی دلدل میں دھنسے جارہی تھی۔ یہ ایسا دور تھا جب مغربی مفکرین کے حوالوں کے بغیر جدید تعلیم یافتہ طبقے کے نزدیک کوئی چیز معتبر نہیں سمجھی جاتی تھی مگر شبلی نعمانی نے مسلمانوں کے ذہنوں کو جلا بخشی اور ان کے اندر تاریخی شعور کو بیدار کیا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے شبلی کے اس کارنامے کا خاص طور پر ذکر کیا ہے:

> ''مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کے سلسلے میں مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے حصہ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جنھوں نے ''الہلال'' کی نظموں اور ''مسلم گزٹ'' کے مضامین کے ذریعہ برطانیہ کی وفاداری کی پالیسی اور مسلمانوں کی کمزور سیاست پر سخت تنقید کی اور تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہن کو متاثر کیا۔''[۲]

جب ہم کلیات شبلی کی ورق گردانی کرتے ہیں تو سید سلیمان ندوی کے پر مغز مقدمے کے بعد ہماری نظر ان کی مثنوی صبح امید پر نظر پڑتی ہے، اس مثنوی میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی کہانی کے علاوہ سرسید اور علی گڑھ تحریک کو امید کی صبح نو کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس زمانے میں حالی کے مسدس کی گونج پورے ہندوستان میں سنائی دے رہی تھی۔ شبلی مسدسِ حالی سے متاثر ضرور ہوئے لیکن انھوں نے حالی کی طرح مرثیہ خوانی نہیں کی۔ شبلی کی نظم ''صبح امید'' جو ۱۸۸۵ء کے زمانے کی تخلیق ہے، اس میں وہ یاس انگیز لے نہیں پائی جاتی جو ''مسدس حالی'' کے رگ و پے میں موجود ہے۔ مثنوی ''صبح امید'' میں قوم کے تنزل کا نقشہ اس طرح دکھایا گیا ہے:

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام
جب قوم تھی مبتلائے آلام
وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی
جو تاج تھی فرق آسماں کی
تھے جس پر نثار فتح و اقبال

کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال
گل کر دیے تھے چراغ جس نے
قیصر کو دیے تھے داغ جس نے
وہ نیزہ خوں فشاں کہ چل کر
ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھوئیں اڑا دیے تھے
اٹلی کے کنوئیں جھکا دیے تھے(۳)

اور زوال کی منظر کشی ملاحظہ ہو:

یہ قوم کہ تاج آسماں تھی
اب کوئی گھڑی کی مہماں تھی
تھے جان کے پڑگئے جو لالے
ہر سانس پہ لیتی تھی سنبھالے
جس چشمے سے اک جہاں تھا سیراب
وہ سوکھ کے ہو رہا تھا بے آب
پامال ہوا تھا بوستاں کیا
آئی تھی بہار پر خزاں کیا[۴]

دورِ زوال کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

بیہودہ فسانہائے پاریں
زل و خط و خال کے مضامیں

وہ نوک مژہ کی نیزہ بازی
وہ ترک نگہ کی فتنہ سازی
یہ طرز خیال تھا ہمارا
یہ فن ، یہ کمال تھا ہمارا
جغرافیہ کا وجود سارا
ہر چند کہ ہم نے چھان مارا
کی سیر بھی گرچہ بحر و بر کی
لیکن نہ خبر ملی کمر کی
نالوں کو دکھائے جب تماشے
گردوں کے اڑا دیے پرخچے[۱۵]

اسلامی تہذیب و معاشرت کی خستہ حالی پر یوں نوحہ کناں ہوئے:

اپنی تو ہمیں نہ کچھ خبر تھی
اوروں کے عیوب پر نظر تھی
لڑ پڑتے تھے بات بات میں ہم
ڈوبے تھے تعصبات میں ہم
دکھلائی کمال دیں داری
مومن کو بنا دیا جو ناری
دین دار برائے نام تھے ہم
وابستہ رسم عام تھے ہم[٦]

آخر میں صبح امید کی نوید یوں سناتے ہیں:

موقع ہے یہی ہنر دکھاؤ
جو کہتے تھے آج کر دکھاؤ

کر دو جو گزشتہ کی تلافی
ثابت ہو زمانے پر کہ ابھی بھی
گو دور فلک ہوا دگرگوں
پھر تو رگوں میں ہے وہی خوں
اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی
اس راکھ میں کچھ شرر ہیں اب بھی
اس جام میں ہے شراب باقی
اب تک ہے گہر میں آب باقی
گو خوار ہیں طرز وخو وہی ہے
مرجھا گئے پھول بو وہی ہے[۷]

حالی کے مقابلے میں شبلی کے ہاں ملی مسائل کا ادراک اگرچہ زیادہ عمیق اور بالیدہ دکھائی دیتا ہے لیکن مجموعی خصوصیات کی بنا پر مسدسِ حالی کا درجہ فائق ہے اور قبولیتِ عام کی سند بھی اسی کے حصے میں آئی ہے۔ مثنوی صبح امید کے علاوہ شبلی نے ''قومی مسدس'' نام کی ایک نظم قومی تھیٹر علی گڑھ میں اپنی پر سوز آواز میں سنائی تھی جہاں دیگر اکابرین کے ہمراہ سرسید بھی موجود تھے۔ کہتے ہیں کہ شبلی نے امت مرحوم کی شاندار روایات اور اور عظمت رفتہ کو اس انداز سے پیش کیا تھا کہ مجمع پر سکتہ طاری ہو گیا اور بیشتر حضرات آبدیدہ ہو گئے۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کون تھا جس نے کیا فارس و یوناں تاراج
کس کی آمد میں فدا کر دیا جیپال نے راج
کس کو کسریٰ نے دیا تخت و زر وافر و تاج
کس کے دربار میں تاتار سے آتا تھا خراج
تجھ پہ اے قوم اثر کرتا ہے افسوں جن کا
یہ وہی تھے کہ رگوں میں ہے ترے خوں جن کا
ہم نے مانا بھی کہ دل سے بھلا دیں قصے

یہ سمجھ لیں کہ ہم ایسے ہی تھے اب ہیں جیسے
یہ بھی منظور ہے ہم کو کہ ہمارے بچے
دیکھنے پائیں نہ تاریخ عرب کے صفحے
کبھی نہ بھولے بھی سلف کو نہ کریں یاد اگر
یادگاروں کو زمانے سے مٹا دیں کیونکر
مردہ شیراز و صفاہان کے وہ زیبا منظر
بیت حمرا کے وہ ایوان وہ دیوار وہ در
مصر و غرناطہ و بغداد کا ایک ایک پتھر
اور وہ دہلی مرحوم کے بوسیدہ کھنڈر
ان کے ذروں میں چمکتے ہیں وہ جوہر اب تک
داستانیں انھیں سب یاد ہیں ازبراب تک
ان سے سن کے کوئی افسانہ یارانِ وطن
یہ دکھادیتی ہیں آنکھوں کو وہی خواب کہن
تیرے ہی نام کا اے یہ گاتے ہیں بھجن
تیرے ہی نغمہ پُر درد کے ہیں یہ ارگن
پوچھتا ہے جوکوئی ان سے نشانی تیری
یہ سنا دیتے ہیں سب رام کہانی تیری[۸]

اس نظم کا فکری پہلو بھی مثنوی ''صبح امید'' کی طرح ہے، نظم کا ہر مصرعہ ایک فکر انگیز داستان بیان کر رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ کہنے والے کی کسک وتڑپ کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔ مولانا شبلی کے دل میں ملی ہمدردی کے جذبات کس قدر موجزن تھے اس بات کا اندازہ ان کی نظم ''خیر مقدم ڈاکٹر انصاری'' پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر نے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں ایک طبّی کیمپ بلقان بھیجا تھا۔ یہ طبّی وفد لکھنؤ اسٹیشن سے روانہ ہوا، الوداع کرنے والی

جماعت میں مولانا شبلی بھی موجود تھے،اس وقت ان کے جذبات کی کیفیت شیخ اکرام یوں بیان کرتے ہیں:

''گاڑی روانہ ہونے لگی تو انھوں نے وفور جوش میں چاہا کہ ڈاکٹر انصاری کے پاؤں کا بوسہ لیں لیکن ڈاکٹر صاحب اس وقت بوٹ پہن رکھے تھے،علامہ ان ہی سے لپٹ گئے،لب سے بوٹوں کے بوسے لیے ،آنسوؤں سے ان کے گرد و غبار کو دھویا اور اس طرح اس مجسمہء جوش وجذبات نے اپنے سوزِ دروں کو ٹھنڈا کیا۔''[۹]

جنگ طرابلس وبلقان پر ''ترکوں سے خطاب''، ''شہر آشوب اسلام''، ''علمائے زندانی''، ''خیر مقدم ڈاکٹر انصاری''، سب ایسی نظمیں ہیں جو سامراجیت کے خلاف اور ملی جذبہ کے تحت تحریر ہوئیں ہیں۔علامہ شبلی نعمانی کی مشہور نظم جو انھوں نے ''شہر آشوب اسلام'' کے عنوان سے لکھی تھی،اس کے اشعار آج بھی درد مند دلوں کے زخم تازہ کر دیتے ہیں کیونکہ آج بھی مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ کی چیرہ دستیوں کے خوفناک مناظر دیکھ کر ماضی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ نظم ایک دردمند مسلم کی قلبی کیفیات کا سچا اظہار ہے۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حکومت پر زوال آیا تو نام ونشاں کب تک چراغ کشتہ محفل سے اُٹھے گا دھواں کب تک

قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیے پرزے
فضائے آسمانی میں اُڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جا چکا ، فارس گیا ، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک
یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اُسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک
یہ سب ہیں رقص بسمل کا تماشا دیکھنے والے
یہ سیر ان کو دکھائے گا شہید نیم جاں کب تک
یہ وہ ہیں نالہ مظلوم کی لے جن کو بھاتی ہے

یہ رات اُن کو سُنائے گا یتیم ناتواں کب تک
کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تابہ کے حشر انگیزیاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہو گا اس کا امتحان کب تک
نگارستان خون کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخم ہائے خوں چکاں کب تک
یہ مانا گرمی محفل کے ساماں چاہییں تم کو
دکھائیں ہم تمھیں ہنگامہ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا قصہ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے درد دل کی داستاں کب تک
کہاں تک لو گے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک
زوال دولت عثمان زوال شرع ملت ہے
عزیزو فکر فرزند و عیال وخانماں کب تک
پرستاران خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو پھر یہ احترام سجدہ گاہِ قدسیاں کب تک
جو گونج اُٹھے گا عالم شور ناقوس کلیسا سے
تو پھر یہ نغمہ توحید و گلبانگ اذاں کب تک
بکھرتے جاتے ہیں شیرازہ اوراق اسلامی
چلیں گی تند باد کفر کی یہ اندھیاں کب تک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں

کہ اب امن و امان وشام و نجد و قیرواں کب تک[۱۰]

مولانا شبلی کی ملی شاعری میں ایک اہم نظم ''ہنگامہ مسجد کانپور'' ہے، کان پور کے محلہ مچھلی بازار میں ایک مسجد بر سرِ راہ تھی، وہاں سے ایک نئی سڑک نکالی گئی، جس میں مسجد کا ایک حصہ جو وضو خانہ تھا بیچ میں آگیا، اس کو مسلمانوں کی مرضی کے خلاف منہدم کر دیا گیا، اس واقعہ نے تمام مسلمانوں میں غم و غصے کی آگ لگادی، جلسہ ہوا، اس کے بعد مسلمان دیواریں بنانے لگے، حکام نے پولیس اور فوج کو گولی چلانے کا حکم دے دیا، جس کی وجہ سے بچے، بوڑھے، نوجوان کافی تعداد میں شہید ہوگئے، اس واقعے نے سارے ملک کے شاعروں، ادیبوں مقررین اور مذہبی و سیاسی قائدین کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، مولانا شبلی پر بھی اس سانحے کا بے حد اثر ہوا، انہوں نے اپنے سوز دروں کا اظہار تقریباً بارہ نظموں کی شکل میں کیا ہے۔ ان نظموں کو سیاسی اور ملی دونوں تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے، انگریزوں سے نفرت اور احتجاج کا عنصر سیاسی پہلو سے جبکہ ملتِ اسلامیہ ہند سے ہمدردی کا جذبہ اور اسلامی شعائر (مسجد) کے انہدام کا واقعہ ملی پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آ گئی ہے منتظر نفخ صور ہیں
کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادہ فنا
جو خاک و خون میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں

پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگانِ معرکہء کان پور ہیں[۱۱]

جب یہ واقعہ پیش آیا تو اس وقت مولانا بمبئی میں تھے اور انھیں اس بات کا افسوس تھا کہ وہ خود کشتگانِ کانپور میں نہیں رہے۔ اس بات کا اندازہ ان کے اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے:

شہیدان وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محروم سعادت ہے[۱۲]

اس سانحے کو شبلی نے ایک اور نظم ''آپ ظالم نہیں زنہار پر ہم ہیں مظلوم'' میں اس سے بھی زیادہ غم انگیز اور پر تاثیر انداز میں بیان کیا ہے۔

ہم غریبوں کو نہ پہلے تھا نہ اب ہے انکار
ہے ہر اک شہر میں آپ کے انصاف کی دھوم
یہ بھی تسلیم ہے ہم کو کہ یہ جو کچھ بھی ہوا
اس میں ملحوظ رہے عدل کے آداب و رسوم
آپ قانون کی حد سے نہ بڑھے یک سرِ مو
فیر کا حکم دیا اپنے نے آپ نے جب بحرِ ہجوم
گولیں کھا کے جو گرتے تھے جوانانِ حسیں
سب یہ کہتے تھے قیامت ہے کہ جھڑتے ہیں نجوم
گولیوں کے تھے نشاں منبر و محراب پر
بسکہ درکار ہے مسجد کے لیے نقش و رسوم
جا بجا خون سے مسجد ہے نگاریں اب تک
یہ صفت وہ ہے کہ تا حشر نہ ہوگی معدوم
پا بہ زنجیر تھے مجرم بھی تماشائی بھی
اور پلس کو تھا یہ عذر کہ ہم ہیں محکوم
واقعہ یہ ہے غرض کوئی نہ مانے نہ سہی
''آپ ظالم نہیں زنہار پر ہم ہیں مظلوم''[۱۳]

آخر کار شبلی انگریزی حکومت کی آنکھوں کا کانٹا بن گئے۔ جب اگست ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو شبلی نے ایک نظم ''جنگ یورپ اور ہندوستان'' کے عنوان سے لکھی جو انگریزوں کے خلاف شبلی کی شدید نفرت کی غماز ہے۔ اسی نظم کی بنیاد پر انگریزی حکومت نے ان کی گرفتاری کا حکم صادر کیا لیکن اسی دوران میں ان کی موت واقع ہو گئی جس کے سبب اس حکم گرفتاری کو عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا۔

مندرجہ بالا تجزیے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ملی شعور کے ادراک اور فروغ میں شبلی کا نام اور کام بہت ممتاز و منفرد ہے۔ ان ہی کی قائم کردہ روایت کے مطابق نوجوان شاعروں کی ایک پوری کھیپ نے ملی شعور کے تسلسل کو جاری و ساری رکھا، جس میں مولانا محمد علی جوہر، اقبال اور مولانا ظفر علی خان کا نام بہ طور خاص پیش کیا جا سکتا ہے۔ اقبال کی شاعری میں ملی شعور کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ شبلی نے جو کچھ سوچا تھا اقبال نے اس فکر کو بہت آگے اور بہت اوپر تک پہنچا دیا۔ شبلی کے بعد اس سلسلے نے حفیظ جالندھری کے ''شاہنامہ اسلام'' تک پہنچ کر ایک طویل رزمیے کی شکل اختیار کر لی۔

حوالہ جات

۱۔ مقالات یوم شبلی، شیخ عطاء اللہ، شبلی ایک پین اسلامسٹ، اردو مرکز، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۸۸

۲۔ ابوالحسن علی ندوی، مولانا، ہندوستانی مسلمان، مجلس تحقیقات، لکھنؤ، ۱۹۶۱ء، ص ۱۷۳

۳۔ شبلی نعمانی، کلیاتِ شبلی اردو، مرتبہ علامہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ہند، س۔ن، ص ۲۰

۴۔ ایضاً ، ص ایضاً

۵۔ ایضاً ، ص ۲۲

۶۔ ایضاً ، ص ایضاً

۷۔ ایضاً ، ص ۳۴

۸۔ ایضاً ، ص ۳۹

۹۔ شیخ محمد اکرام، شبلی نامہ، بحوالہ جدید نظم۔ حالی سے میراجی تک، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ص ۱۲۹

۱۰۔ کلیاتِ شبلی اردو، ص ۶۵

۱۱۔ ایضاً ، ص۸۴

۱۲۔ ایضاً ، ص۸۵

۱۳۔ ایضاً ، ص ایضاً